غالب کی داستان محبّت

مسلم ضیائی*

یار در عہد شبابم بہ کنار آمد و رفت
ہمچو عیدی کہ در ایامِ بہار آمد و رفت

مرزا غالب کے ہزاروں دوستوں میں ایک دوست ، مولوی تفضل حسین خاں بھی تھے ۔ ان کو ایک غم انگیز اور جانگزا حادثہ پیش آیا ۔ غالب اور تفضل حسین خاں کے ایک مشترک دوست اعتقادالدولہ نوروز علی خاں تھے ۔ انہوں نے غالب کو اپنے نام تفضل حسین خاں کا نامہؑ غم دکھا کر چاہا کہ غالب خط لکھ کر تفضل حسین خاں کا غم غلط کریں ۔

غالب نے اپنے خط میں تعزیت اور اظہار ہمدردی کے ساتھ اپنی داستان محبت کی اس طرح نقاب کشائی کی ہے :

" بروزگار جوانی . . . مرا نیز زہراب ایں بلا (مرگ دوست) ساغر ریختہ اند و برہگذار جنازۂ دوست غبار از نہاد شکیبم برانگیختہ ۔ روز ہاے روشن بماتم دلدار پلاس نشین و کبود پوش بودہ ام و شبہائی سیاہ بخلوت غم پروانہ ، شمع خموش بودہ ام ۔ ہمخوابہ کہ وقت وداع از رشک جدایش نتوان سپرد ، چہ بیداد است ، تن نازنینش را بخاک سپردن و محبوبہ کہ از بیم چشم زخم نرگس بہ گلگشت چمن نتوان برد ، چہ ستم است نعش او را بگورستان بردن ۔

خاک خون باد کہ در معرض آثار وجود
زلف رخ در کشد و سنبل و گل بار دہد

صیاد دام گسستہ ، صید از بند بدرجستہ را ، بآسودگی چہ پیوند ؟ و گلچین گل از دست دادہ ، گلبن از پا فتادہ را ، بخرمی چہ آمیزش ؟ تن دادن شاہد بہمدیؑ عاشق ، اگرچہ پس از یک عمر جانفشانی است ، دل دادگان دانند کہ چہ پایہؑ مہرورزی و مہربانی است ۔ خوشا معشوقہؑ وفا سگال کہ تلافی را از بایست پایہ تر نہادہ باشد و از ہر کہ بغمزۂ دل بردہ ہم بمہرش جان دادہ باشد !

*آقائی مسلم ضیائی ، دانشمند معروف کراچی ۔

با این ہمہ کہ غم مرگ دوست جانگزاست و اندوہ جدائی جاوید جگر پالان . . .''[۱]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تفضل حسین خان کو خط لکھتے ہوئے غالب کو اپنی جوانی کا افسانۂ غم یاد آ گیا تھا جب انہوں نے محبت کی تھی اور ان کی محبوبۂ دلنواز کی وفات نے ان کی زندگی کو تاریک اور ویران کر دیا تھا ۔ یہ محبوبہ غالب سے والہانہ محبت کرتی تھی ۔

ایک اور خط میں حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ چنّا جان کے مرنے پر تعزیت نامہ لکھتے ہوئے اپنی داستانِ محبت کی اس طرح پردہ کشائی کرتے ہیں :

بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں ، جس پر مرتے ہیں ، اس کو مار رکھتے ہیں ۔ میں بھی مغل بچہ ہوں ، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے ۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی ، کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں ، مغفرت کرے ۔

چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے ۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا ۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں ، پھر بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں ۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا ۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی ۔[۲]

یہ خط جون ۱۸۶۰ (ذی قعدہ ۱۲۷۶) میں لکھا گیا کیونکہ چنا جان کی وفات ۹ ذی قعدہ ۱۲۷۶ (۲۹ مئی ۱۸۶۰) کو ہوئی تھی[۳] ۔ اگر ہم اس میں سے بیالیس سال منہا کریں تو (۱۲۷۶ — ۴۲ = ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء) غالب کی محبوبہ کا سال وفات قرار پاتا ہے جب غالب کی عمر ۲۱ ، ۲۲ سال تھی[۴] ۔ قیاس کہتا ہے کہ اس ستم پیشہ ڈومنی سے غالب کے معاشقے کی عمر زیادہ طویل نہ تھی ، بس ایک دو سال یعنی غالب نے اس ستم پیشہ ڈومنی سے انیس بیس سال کی عمر میں عشق کیا تھا ۔ لیکن یہ ستم پیشہ ڈومنی کون تھی ؟ غالب نے اس کے بارے میں کیا اور کس طرح لکھا ہے ؟ ہمیں سرور کے عمدۂ منتخبہ سے اسد تخلص

۱- پنج آہنگ ۔ نولکشور ۔ لکھنو ، ۱۹۷—۱۹۹ ۔
۲- اردوے معلی (دہلی ۱۸۶۹)، ۲۵۲ ۔
۳- دیوان مہر (مطبع الٰہی ۔ آگرہ) ، ۳۷۳ ۔
۴- اگر ۱۲۱۳ سال ولادت مان لیا جائے تو ۲۰ ، ۲۱ سال ۔ ملاحظہ ہو اردو نامہ جنوری ۱۹۶۷ '' غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت '' ۔

کے تحت غالب کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ :

. . . جوان قابل و یار باش دردمند۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ ذوق ریختہ گوی در خاطر متمکن ، خو کردۂ غم ہائے عشق مجاز ، تربیت یافتہ غمکدۂ لیاز در فن سخن سنجی متبع محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمتہ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد۔[۵]

چونکہ سرور سے رابطہ یک جہتی مستحکم تھا اس لیے وہ یقیناً غالب کے غمہائے عشق "مجاز" سے واقف تھے۔ اگرچہ ان کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت غالب طرز بیدل چھوڑ کر "موجد طرز خود" ہو چکے تھے اور ابھی تک خوش معاشی سے زندگی بسر کر رہے تھے ، لیکن افسوس سرور نے اجمال سے کام لیتے ہوئے غالب کے غمہائے عشق مجاز پر روشنی نہیں ڈالی۔ آئیے ہم غالب ہی کی تحریروں سے اس داستان عشق کی مختلف کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کریں۔

ہماری زبان میں ڈومنی کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا لیکن "ستم پیشہ ڈومنی" لکھتے وقت غالب کے ذہن میں کیا تھا ؟ اس کی تفصیل غالب ہی کی زبانی سنیے۔ اپنے دوست ، منشی نبی بخش حقیر کو "مغاں شیوہ بانواں"[۶] کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف جمع کا ہے یعنی بیبیاں۔ مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل رخسار اور ماہ جبین کی ترکیب ہے یعنی وہ شخص جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی ہے اور شیوہ مغاں

۵۔ عمدۂ منتخبہ خطی : سرور نسخہ قومی آثار خانہ ، کراچی۔
۶۔ غالب نے مغاں شیوہ کی ترکیب کلیات فارسی میں کئی جگہ استعمال کی ہے :

زہے بتان مغاں شیوہ داد خواہانش	زدست ہائے حنا بستہ گل بدامانش
مسکین نہ دیدۂ ز مغاں شیوہ بانواں	در خوابگاہ بہمن و دارا گریستن
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہدان	فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار
آتش ہنگامہ بجان داشتی	داغ مغاں شیوہ بتان داشتی

کا سا ہے ۔۷ مغ آتش کدے کا کارفرما اور چونکہ بادشاہان پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدوں کی عابد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے اور شراب بھی (چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک اور متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے) مغوں کی تحویل میں رہتی تھی تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل جانیں ، اس کو بقدر مناسب دیں ۔ بہرحال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوبصورت اور خوش سیرت ، عالم فاضل طرحدار ، بذلہ‌گو ، حریف ظریف ہوا کرتے تھے ۔

اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ ، مدح معشوقوں کی ٹھہرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور ترچھا اور بانکا مانند مغوں کے ۔ اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہے کہ جیسے کسو بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے ۔

قصہ مختصر ، مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے ہیں جو بہت گرم اور شوخ اور شیریں حرکات اور چالاک ہو ۔

مغاں شیوہ بانواں ، مغاں شیوہ دلبراں ، مغاں شیوہ شاہداں ، خواہی بہ مجمع ، خواہی بہ انفراد ، ترکیب مقلوب ہے یعنی بانواں مغاں شیوہ ۔ قس علی ہذا اور الفاظ . . . "۸

غالب کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں یہی مغاں شیوہ ، ستم پیشہ ڈومنی تھی جو کوئی شاہد بازاری نہ تھی بلکہ گرم ، شوخ ، شیریں حرکات ، چالاک ، خوش بیان ، طرحدار ، بانکی ترچھی سروقامت حسینہ تھی (جس کا سراپا غالب نے اپنی اردو اور فارسی شاعری میں کئی جگہ لکھا ہے) جس کے بدن پر اس کی قبائے تنگ ، کلی کی طرح کھلی جاتی تھی ۔ یہ وہی مطربہ ہے جس کے بارے میں غالب نے اپنی غزلوں میں بار بار لکھا ، جس کی شیریں حرکاتی کا مثنوی ابر گہر بار میں ذکر کیا۹ اور جسے زندگی بھر یاد کرتے رہے ۔

کار با مطربہٴ زہرہ نہادی دارم گر لبم نالہ ہنجار سراید چہ عجب

۷- مغ : مرد روحانی زرتشتی پیشوائے مذہبی زرتشتی ، مغان (جمع) طبقہٴ پائین تر از موبدان بودہ اند ، فرہنگ عمید ، تہران ۔

۸- سید آفاق حسین ، نادرات غالب ۔ خط بنام حقیر نوشتہ ۴ جون ۱۸۴۸ ، ۳-۲۰۲ ۔

۹- نہ نازک نگاری کہ نازش کشم | پہر بوسہ زلف درازش کشم
گریزد دم بوسہ اینش کجا | فریبد بسوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گو | دہد کام و نبود دلش کام جو

شیوۂ دارد و من معتقد خوی ویم   شوقم از رنجش او گر بفزاید چہ عجب

پھر اسی ''رہزن تمکین و ہوش'' مطربہ زہرہ نہاد اور بت ''چمن سامان'' کے بارے میں کہتے ہیں :

چمن سامان بتی دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامی کز ادائے خویش پر گل کردہ دامان را
چو غنچہ جوش صفائی تنش ز بالیدن
دریدہ برتن نازک قبائے تنگش را

نسخۂ فوجدار (ف) نوشتہ صفر ۱۲۳۷ کے یہ اشعار بھی لائق توجہ ہیں :

اگر وہ سرو جان بخش خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو
بہ یاد قامت اگر ہو بلند آتش غم
ہر ایک داغ جگر آفتاب محشر ہو
صدف کی ہے ترے نقش قدم میں کیفیت
سرشک چشم اسد کیوں نہ اس میں گوہر ہو
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

یہی وہ سرو قامت محبوبہ ہے جسے حوران بہشت اور خوبان روزگار پر ترجیح دیتے ہیں :

نخواہم از صف حوران ز صد ہزار یکی   مرا بس است ز خوبان روزگار یکی

اسی محبوبہ دلنواز کا سراپا لکھتے ہوئے ، اس کی کافرادای ، بالا بلندی ، کوتہ قبای ، مینو لقای ، غافل نوازی ، عاشق ستای ، زردشت کیشی ، آتش‌پرستی اور زمزمہ سرای کا ذکر کرتے ہوئے اس کا حسن ، اس کی موسیقی ، اس کا مزاج ، اس کی تابش تن اور اس کی ادائیں بیان کرتے ہیں ۔ یہ اس عورت کا جسمانی اور ذہنی سراپا ہے جس کی زلف پر خم کے غالب اسیر ہوئے تھے ۔ ملاحظہ ہو :

تابم ز دل برد کافر ادائے   بالا بلندے کوتہ قبائے
از خوے ناخوش دوزخ نہیبے   وز روے دلکش مینو لقائے
در دیر گیری غافل نوازے   ور زود میری ، عاشق ستائے
زردشت کیشے ، آتش پرستے   برسم گزارے ، زمزم سرائے
چون مرگ ناگہ بسیار تلخے   چون‌جان شیرین اندک وفائے
ورکام بخشی ممسک امیرے   در دلستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے پوزش پذیرے   طاقت گدازے صبر آزمائے
در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے   در مہربانی بستان سرائے

از زلف پرخم مشکین نقابے — از تابش تن زرین ردائے
در عرض دعوئ لیلی نکرہے — بر رغم غالب مجنوں متائے

ایک اور غزل میں اس مغان شیوہ محبوبہ سے اپنے آغاز عشق کی داستان سناتے ہیں جب اس مغنیٔ آتش نفس ''شوخ اور شیریں حرکات'' مطربہ سے محبت کرتے تھے اور ابھی خود اس کے محبوب نہ ہوئے تھے۔ اس ''نادان صنم'' کا حال انھی کی زبان سے سنیے :

نادان صنم من روش کار نداند — بر ہر کہ کند رحم ، سر از بار نداند
بی دشنہ و خنجر نبود معتقد زخم — دلہاے عزیزاں ، بہ غم افگار نداند
بر تشنہ لب بادیہ سوزد دلش از مہر — اندوہ جگر تشنۂ دیدار نداند
گویم سخن از رنج و براحت کندش طرح — روز سیہ از سایۂ دیوار نداند
دل را بغم آتش کدۂ راز نہ سنجد — دم را بہ تف نالہ شرر بار نداند
عنوان ہوا داریِ احباب نہ بیند — پاداں ہوسناکیِ اغیار نداند
دشوار بود مردن و دشوار تراز مرگ — آنست کہ من میرم و دشوار نداند
دانم کہ ندانست و ندانم کہ غم من — خود کم تر از آنست کہ بسیار نداند
از نا کسیِ خویش چہ مقدار عزیزم — در عربدہ خوارم کند و خوار نداند

پھر اس نادان محبوبہ کو راست مخاطب کرتے ہوئے کبھی اس کے نقشِ کف پا کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس کے گریبان کو رونق صبح بہار کہتے ہیں :

اے گل ! از نقش کف پاے تو دامان ترا
گلفشان کردہ قبا سرو خرامان ترا
تا ز خونِ کہ ازیں پردہ شفق باز دمد
رونق صبح بہار است گریبان ترا

کبھی آئینہ خانے میں اس کا جلوہ وہ نقشہ پیدا کرتا ہے جو شبستان میں آفتاب نکلنے پر نظر آتا ہے۔ کبھی اپنی ''ناہید'' کی تمثال کا سیابی جلوہ دیکھتے ہیں تو سینکڑوں ذرے دیدہ ہاے خاک کے مانند ، پر افشاں نظر آتے ہیں۔ کبھی اس کے نقش قدم میں ''خیابان خیاباں ارم'' اور سرو قامت میں قیامت کا فتنہ ، مگر ایک قد آدم کمی کے ساتھ نظر آتا ہے اور کبھی اس ''محو آئینہ داری'' کو بڑی تمناؤں سے دیکھتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں[10] :

۱۰۔ کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا
یہ کس ناہید کی تمثال کا ہے جلوہ سیابی
کہ مثل دیدہ ہائے خاک ، آئینے پر افشاں ہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سروقامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محو آئینہ داری! تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ساتھ ہی اس کی آرایش کو دیکھ کر دل میں اندیشہ ہائے دور و دراز بھی پیدا ہوتے ہیں - اپنی گرفتاری کا بھی احساس ہے اور قوت پرواز کا بھی اندازہ ہے - حسرت ناز کے بجائے ''ناز کھینچنے'' کی بھی آرزو ہے -

تو اور آرایش خم کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لاف تمکیں فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہوں کہ اس ستم گر سے ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں جس کے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز! اے ترا ظلم سر بسر انداز!
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزش سجدہ ہائے اہل نیاز
نگہ التفات سوئے اسد میں غریب اور تو غریب نواز

اسی محبت کے دور میں، آغاز الفت کے زمانے میں اپنی محبوبہ کو ایک منظوم خط لکھتے ہیں جس میں تعریف بھی ہے اور شکایت بھی:

زہے باغ و بہار جان فشانان! غمت چشم و چراغ راز دانان
بصورت اوستاد دل فریبان بمعنی قبلۂ نا مہربانان
چمن کوے ترا از رہ نشینان ختن سوے ترا از باد خوانان
بلایت چہرہ با مشکینہ مویان ادایت چہرہ بر نازک میانان
غمت را بختیان زنار بندان گلت را عندلیبان بید خوانان
وصالت جان توانا ساز پیران خیالت خاطر آشوب جوانان
دل دانش فریبت را بگردن وبال رونق جادو بیانان
غم دوزخ نہیبت را بدامن گداز زہرۂ آتش زبانان
میانت ہائے لغز موشگافان دہانت چشم بند نکتہ دانان
دل از داغت بساط گل فروشان تن از زحمت ردائے باغبانان
سگ کوی ترا از کاسہ لیسی لب پر دعوی شیرین دہانان
سر راہ ترا در خاک روبی نسیم پرچم گیتی ستانان
بہ پشتی بانئ لطف تو امید قوی ہمچون نہاد سخت جانان

بالا دستیٔ عفو تو عصیان زبوں ہمچوں نشست نا توانان
ز ناحق کشتگان راضی بجانت کہ غالب ہم یکی باشد ازانان

اس غزل میں اپنی مغان شیوہ محبوبہ کے انداز دلربایانہ اور اوصاف معشوقانہ بیان کرتے ہوئے اس کے مزاج کے تضادات بھی بیان کیے ہیں - وہ باغ و بہار جانفشانان ہے اور اس کا غم چشم و چراغ راز داناں - دیکھنے میں تو اوستاد دل فریباں ہے لیکن حقیقت میں قبلہٗ ناسمرباناں - اس کا کوچہ رہ نشینوں کے لیے چمن ہے اور موئے سیاہ ختن کے مانند معطر - سیاہ زلفوں والی حسینائیں اسے دیکھ کر جلتی اور عنادل اس کے گل رخسار پر زمزمہ سنجی کرتی ہیں - وہ ایسی حسینہ ہے جس کا وصل ''توانا ساز پیران'' ہے اور جس کا خیال جوانوں کے لیے ''خاطر آشوب'' - اس کے سامنے جادو بیانوں کی دانش مندی ختم ہو جاتی ہے اور آتش زبانوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں - اس کی کمر ''موشگافوں'' کے پیروں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے اور اس کی گفتگو بڑے بڑے نکتہ دانوں کو چپ کرا دیتی ہے - کتنے ہی لوگ ہیں جن کے داغ دار دل ، بساط گل فروش بنے ہوئے ہیں اور جن کے زخمی دل ، باغبانوں کی پھولوں سے بھری ہوئی چادر نظر آتے ہیں - بادشاہوں کے پرچموں سے نکلی ہوئی نسیم ، اس کی گلی میں خاک روبی کرتی ہے اور اس کی مہربانی سے امید ، سخت جانوں کے دلوں کے لیے قوی اور مضبوط ہو جاتی ہے - آخر میں کہتے ہیں کہ ان ''ناحق کشتگاں'' میں جو تیرے لیے خوشی سے جان دیتے ہیں ، ایک شخص اور بھی ہے ، جسے غالب کہتے ہیں - وہ بھی تجھ سے محبت کرتا اور تیرا ہی مارا ہوا ہے - یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف ''عیسیٔ مہربان'' کے مانند محبوبہ تھی اور دوسری طرف ''طبع الم خیز'' درد آفرینی میں مشغول تھی - زندگی کشمکش کے ایک عجیب و غریب دور سے گزر رہی تھی :

عیسیٔ مہربان ہے شفاء ریز یک طرف
درد آفرین ہے طبع الم خیز یک طرف
مفت دل و جگر خلش غمزہ ہائے ناز
کاوش فروشیٔ مژۂ تیز یک طرف
ہر مو بدن پہ شہپر پرواز ہے مجھے
بے تابی دل تپش انگیز یک طرف
یک جانب اے اسد غم فرقت کا لیم ہے
دام ہوس ہے زلف دل آویز یک طرف

یہ وہ زمانہ ہے جب غالب ہی نہیں غالب کا عشق بھی شباب پر ہے اور اب وہی نہیں ان کی محبوبہ بھی ان سے محبت کرنے لگی ہے - اس زمانے کی

داستان شوق اس طرح سناتے ہیں ۔

شدم سپاس گذار خود از شکایت شوق
زہے ز من بدل بیغمش سرایت شوق

بیزم بادہ گریباں کشودنش نگرید
خوشا بہانۂ مستی ، خوشا رعایت شوق

بر آں غزل کہ سرا خود بخاطر است ہنوز
بیانگ چنگ ادا می کند بغایت شوق

دخاں ز آتش یاقوت ، گردمد عجب مت
عجب تر است ازیں برلبش حکایت شوق

غلط کند رہ و آید بہ کابہ ام ناگاہ
صنم فریب بود ، شیوۂ ہدایت شوق

متاع کاسد اہل ہوس بہم بر زن
کنوں کہ خود شدۂ شحنۂ ولایت شوق

بخود مناز و بہ آموز گار ہم بپزیر
من و نہایت عشق و تو و ہدایت شوق

وہ اپنی محبوبہ کی طرف سے شکایت شوق پر سپاس گزار ہیں کیونکہ اب ان کی محبوبہ کے دل میں ان کی محبت نے گھر کر لیا ہے ۔ وہ محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر بزم شراب میں مستی و مدہوشی کا بہانہ کرکے آتی اور بندوق کا وار کر دیتی ہے ۔ اپنے چنگ پر وہ غزل سناتی ہے جو ابھی شاعر (غالب) کے ذہن ہی میں ہے اور لکھی نہیں گئی یعنی خود عاشق ہو کر عاشق کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ یہ محبت کا جذبہ ہی تو ہے جس نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ غالب یہ کیفیت دیکھ کر حیران رہ جاتے اور کہتے ہیں کہ اگر آتش یاقوت سے دھواں روشن ہو جائے تو حیرت نہ کرو ۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میری محبوبہ کے ہونٹوں پر میری محبت کی داستان ہے ۔ وہ اچانک میرے جھونپڑے میں "راستہ بھول" کر آتی ہے ۔ عشق کی رہنمائی کو دیکھو کس قدر صنم فریب ہے ! اے میری محبوب ! اب چونکہ تو خود "شحنۂ ولایت شوق" ہے اس لیے اہل ہوس کی متاع کا سد کو تباہ کر دے ۔

لیکن اے میری محبوب ! غرور نہ کر ۔ میں جو کہتا ہوں ، اسے مان لے کیونکہ میرا عشق انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور تیری محبت کی نقط ابتدا ہے ۔

اور اب دو نوجوان دلوں میں محبت کی آگ بھڑک رہی تھی ۔ غالب خود اپنے دل کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں :

سینہ بکشودیم و خلقی دید کاینجا آتش است
بعد ازیں گویند ، آتش را کہ گویا آتش است

انتظار جلوۂ ساقی کبابم می کنند
مے بساغر آب حیوان و بہ مینا آتش است

گریہ ات ، در عشق از تاثیر دود آہ ماست
اشک در چشم تو آب و در دل ما آتش است

ای کہ می گوئی تجلی گاہ نازش دور نیست
صبر مشتی از خس و ذوق تماشا آتش است

دوسری طرف محبوبہ کے دل میں محبت کی آگ جل رہی ہے۔ دود آہ کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ آنسو محبوبہ کی آنکھوں میں پانی کے قطرے ہیں لیکن غالب کے دل میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اس لیے وہ کسی ہمدرد اور غمگسار دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ اس کی تجلی گاہ شوق دور نہیں۔ مانا۔ مگر یہ بوی تو سمجھ لو صبر مشت خس ہوتا ہے اور ذوق تماشا آگ، جو ایک لمحہ میں صبر و سکون کا سرمایہ غارت کر دیتی ہے۔

یہ دور غالب کی زندگی میں انتہائی ہیجانی دور ہے۔ راتوں میں کبھی آہیں ہیں، کبھی خاموشی، انتظار ہے، اضطراب ہے، بے چینی ہے اور تڑپ ہے، کسی پہلو چین نہیں، کسی پہلو آرام نہیں، ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے:

جنون محمل بہ صحرائے تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر وامانده است امشب

بہ ذوق وعدہ، سامان نشاطے کردہ پندارم
ز فرش گل، بروے آتشم، بنشانده است امشب

بقدر شام ہجرانش، درازی باد عمرش را
فلک نیز از کواکب سبحہ وا گردانده است امشب

بخوابم می رسد بند قبا وا کردہ از مستی
ندانم شوق من بروے چہ افسون خوانده است امشب

خوش است افسانۂ درد جدای مختصر غالب
بہ محشر می توان گفت آنچہ در دل مانده است امشب

غالب کو اپنی محبوبہ کے آنے کا انتظار ہے، اس نے وعدہ کیا ہے آنے کا۔ وہ سامان نشاط فراہم کرتے اور پھولوں کی سیج آراستہ کرتے ہیں لیکن اس کی غیرموجودگی میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پھولوں کی سیج پر نہیں، آگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جنون محبت نے عالم تحیر میں پہنچا دیا ہے۔ نگہ آنکھوں میں اور آہ جگر میں ٹھہر گئی ہے۔ اپنی محبوبہ کو دعائیں دیتے ہیں کہ اس کی عمر کو درازی شب ہجراں نصیب ہو۔ آسمان بھی ستاروں کی تسبیح لیے سبحہ گردانی میں مشغول ہے۔ ایسی حالت میں (عالم تصور میں) محبوبہ بند قبا وا کیے ہوئے آتی ہے اور غالب حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر میری محبت نے ایسا کون سا فسوں پڑھ دیا، جس کے باعث میری محبوبہ بند قبا وا کیے

ہوئے میرے پاس چلی آئی ہے ۔ آخر میں کہتے ہیں ۔ یہ افسانہ درد جدائی مزے دار بھی ہے اور طویل بھی ۔ میں نے اسے مختصراً بیان کیا ہے ۔ آج میں اسے بیان نہیں کرتا ۔ قیامت کے روز خدا سے کہوں گا کہ آخر تو نے فراق محبوب کو اتنا طول کیوں دیا تھا ۔

اس کے بعد ایک اور فراقیہ غزل میں کبھی موج گل کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بیقراری اور محبت کا اظہار کرتے ہیں کبھی ''طرف جوئبار چمن'' کبھی داغ لالہ ، کبھی آنکھوں اور کبھی رات سے کہتے ہیں :

اے موج گل نوید تماشائے کیستی ؟
انگارۂ مثال سراپائے کیستی ؟

بیہودہ نیست سعی صبا در کنار ما
اے بوے گل ! پیام تمنائے کیستی ؟

خون گشتم از تو ، باغ و بہار کہ بودہ ای
کشتی مرا بغمزہ ، مسیحائے کیستی ؟

یادش بہ خیر تا چہ قدر سبز بودہ ای
اے طرف جوئبار چمن جائے کیستی ؟

از خاک غرقۂ کف خونی دمیدۂ ای
اے داغ لالہ ! نقش سویدائے کیستی ؟

نشنیدہ لذت تو فرومی رود بدل
اے حرف محو لعل شکر خائے کیستی ؟

با نو بہار این ہمہ سامان ناز نیست
فہرست کارخانۂ یغمائے کیستی ؟

از ہیچ غیر نقش نکوئی ندیدہ ای
اے دیدہ ! محو چہرہ زیبائے کیستی ؟

با ہیچ کافر ، این ہمہ سختی نمی رود
اے شب ! بمرگ من کہ تو فردائے کیستی ؟

غالب نوائے کلک تو دل می برد ز دست
تا پردہ سنج شیوہ انشائے کیستی ؟

محبت کے اس طوفانی دور میں عشق بھی تھا حجاب میں ، حسن بھی تھا حجاب میں ۔ قدم قدم پر کھٹکے تھے ، قدم قدم پر اندیشے تھے ۔ کبھی بیم رقیب تھا ، کبھی خوف عزیزاں ، رسوائیاں تھیں اور بدنامیاں ۔ دن تو بہر حال کٹ جاتے تھے لیکن راتیں اپنے ساتھ قیامتیں لاتی تھیں ۔ جب فراق کی تاریکیاں محبت کی

روشنی کو اندیشوں کے اندھیروں میں چھپا دیتی ہیں ۔ اپنی محبوبہ، اپنی جان سے زیادہ عزیز ہستی کے بارے میں شبہات پیدا ہوتے ہیں جن سے بے تابیوں، اضطراب اور وحشت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر جب فراق کی ہر ایک ہی نہیں کئی راتیں ہوں تو کبھی ''زبان سوزد'' کا معاملہ ہوتا ہے اور کبھی ''مغزاستخواں سوزد'' کا۔ ان کربناک اور وحشت انگیز راتوں میں سے ایک رات کی داستان یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''کل میں تجھے اپنی سیہ بختی کی داستان سنا رہا تھا ۔ نظریں آسمان کی طرف تھیں لیکن روئے سخن تیری ہی طرف تھا ۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ رات کو تیری وجہ سے محفل خوباں میں لوگوں پر کیا گذری ؟ خصوصاً صدر مجلس پر جو تیری ہم پہلو تھی ؟ تو نے شمع پر گماں کیا اور غضبناک ہو کر چلی گئی ۔ اس میں شمع کا کوئی قصور نہ تھا ۔ یہ تو میری آہ گرم تھی جس نے تیرے مزاج کی پردہ کشائی کی تھی۔ میں اپنی آہ آتشناک سے جنت کو جلا کر خاکستر کر رہا ہوں تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ تیرے کوچے کی ہمسری کا دعویٰ کر رہی تھی ۔ باد بہاری کی روش سے یہ گماں ہوتا ہے کہ باغ کے سارے پھول اور کلیاں تیری ہی خوشبوؤں کے قافلے کے پیچھے چل رہی ہیں ۔ خدا کرے مرنے کے بعد غالب کی قبر کے اردگرد لالہ و گل کھلتے رہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں تجھے دیکھتے رہنے کی کس قدر خواہش تھی :

دوش کز گردش بختم گلہ برروے تو بود
چشم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود

آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بعتاب
نفسم پردہ کشای اثر خوے تو بود

شب چہ دانی ز تو در مجلس خوباں چہ گزشت
خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود

خلد را از نفس شعلہ فشاں می سوزم
تا ندانند حریفاں کہ سر کوے تو بود

روش باد بہاری بہ گمانم افگند
کاین گل و غنچہ پے قافلۂ بوے تو بود

لالہ وگل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روے تو بود

لیکن بات صرف اتنی نہ تھی ، غالب کی یہ فراقیہ راتیں اور ان میں اس کے دل کی دھڑکنوں کو شاعر نے مستقبل کے لیے اپنی غزلوں میں محفوظ کر دیا ہے ملاحظہ ہو :

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر جو بے تاب تھا

دیکھتے تھے ہم بچشم خود وہ طوفان بلا
آسمان سفلہ جس میں یک کف سیلاب تھا

اور یہ ایک برسات کی رات تھی ، اندھیری رات جس میں شاعر کی بے چینیوں اور اندیشوں کے بادلوں کا ہجوم تھا ۔ دل باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن طبیعت پر عجیب وحشت سی چھائی ہوئی تھی :

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بے تابیاں
شوخیٔ بارش سے مہ فوارۂ سیماب تھا

جوش یاد نغمۂ دمساز مطرب سے اسد
ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا

اور اب اسی زمانے کی ایک اور بھیگی ہوئی رات کا منظر دیکھیے جس میں شاعر نے اپنی افسردگی و بیتابی اور اندیشہ ہائے دور و دراز کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں خود آرای کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

یاں سر پر شور، بے تابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

واں بہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسد
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا[۱۱]

اس زمانے میں غالب نے ایک غزل لکھی جس کی ردیف ''دوست'' ہے ۔ یہ غزل نسخۂ فوجدار محمد خاں میں ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

برقِ خرمنِ زارِ گوہر ہے نگاہِ تیز یاں
اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیِ رفتارِ دوست

ہے سوا نیزے پہ اس کی قامتِ نو خیز سے
آفتابِ صبحِ محشر ہے گلِ دستارِ دوست

اے عدوئے مصلحت! چندے بہ ضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تابِ شوخیِ دیدارِ دوست

لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا ہے اسد
آتش سے سے بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

نسخۂ شیرانی میں یہی غزل تھوڑی سی ترمیم اور چند اشعار کے اضافوں کے ساتھ اس طرح ملتی ہے :

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

(ق)

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

۱۱۔ مندرجہ بالا میں پہلی دو غزلیں نسخۂ فوجدار محمد خاں (بھوپال) میں اسد تخلص کے تحت اور تیسری حاشیہ پر اور نسخۂ شیرانی لاہور میں ہے ۔ نسخۂ شیرانی نسخۂ فوجدار سے نقل کیا گیا لیکن بعض غزلیں نظر انداز کر دی گئی ہیں ۔ نسخۂ فوجدار ۱۲۳۱ء میں لکھا گیا اور نسخۂ شیرانی اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۔ غالب کے فیروز پور اور وہاں سے کلکتہ روانہ ہو جانے کے باعث نسخۂ شیرانی نا تمام رہا ۔ حاشیے پر البتہ چند غزلوں کے اضافے ہوئے جن میں سے بعض پر ''از باندہ فرستادند'' لکھا ہوا ہے لیکن متن ہی کے خط میں ۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یاں بیان کیجیے سپاس لذت آزار دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے اب
ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست[۱]

اس میں لفظ ''اب'' خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقطع محبوبہ کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھا گیا، جب مرزا اسد تخلص چھوڑ کر غالب تخلص اختیار کر چکے تھے لیکن جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے محبوبہ' غالب کی محبوبیت مرنے سے پہلے غالب کے عشق میں بدل گئی تھی - یہ برق تمثال محبوبہ، یہ مطربہ دل نواز، غالب کے ماتم خانے کو اپنی شمع حسن سے منور کرنے لگی تھی اور اب شاعر کی اندھیری راتوں میں صبح تک روشنی رہتی تھی -

ایک ایسی ہی صبح مسرت کی داستان غالب کی زبان سے سنیے جب وہ اپنی دل نواز محبوبہ کو مخاطب کرتے ہیں - انداز تخاطب کی نرمی اور لطافت خاص

۱- نسخۂ فوجدار میں تخلص اسد اور شیرانی میں غالب ہے - دونوں غزلوں کو ملا کر اشعار کی تعداد سولہ ہے - فوجدار کے دو شعر خارج کیے گئے - حاشیہ فوجدار اور شیرانی کے اشعار کی تعداد ۱۴ ہے - میرے خیال میں نسخۂ شیرانی کے اشعار محبوبہ کی زندگی ہی میں لکھے گئے لیکن آخری شعر یعنی مقطع شیرانی وفات کے بعد جس کی غمازی لفظ ''اب'' کرتا ہے - ایسے دو شعر اور ملاحظہ ہوں :

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

طور سے توجہ کی مستحق ہے :

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست مخسپ	جہان جہان گل نظارہ چیدنست مخسپ
مشام را بہ شمیم گلے نوازش کن	نسیم غالیہ سا در وزیدن ست مخسپ
ز خویش حسن طلب بین و در صبوحی کوش	مے شبانہ ز لب در چکیدنست مخسپ
ستارۂ سحری مژدہ سنج دیداریست	بہ بیں کہ چشم فلک در پریدنست مخسپ
تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم	بہ پشت دست بدنداں گزیدنست مخسپ
نشاط گوش برآواز قلقل ست بیا	پیالہ چشم براہ کشیدنست مخسپ
بذکر مرگ شبی زندہ داشتن ذوقیست	گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ

دیکھا آپ نے؟ غالب نے کس قدر حسین منظر کھینچا ہے اور کس طرح اپنی مست خواب محبوبہ کو جگا رہے ہیں ۔ میری محبوب ! نہ سو ، صبح ہو گئی ہے ، کلیاں کھل رہی ہیں ، ہر طرف حسین نظاروں کے پھول بکھرے ہوئے ہیں ، یہ پھول چن لینے کے قابل ہیں ۔ اپنی مشام جاں کو خوشبوؤں سے معطر کر لو ، نسیم عطر بیزی کر رہی ہے ۔ ذرا اپنی طرف سے حسن طلب تو دیکھو ۔ رات کی شراب ہونٹوں سے ٹپک رہی ہے اور صبوحی طلب ہے ، دیکھو چشم فلک یعنی ستارۂ سحری ''مژدہ سنج دیدار'' ہے ۔ اب وہ رخصت ہو رہا ہے ۔ سنو ! میری محبوب سنو ! تم اپنے خواب ناز میں مست ہو اور سحر ڈوبتے ستاروں پر افسوس کر رہی ہے ۔ مسرت قلقل مینا پر گوش بر آواز ہے اور پیالہ چشم براہ ۔ اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لو ۔ اور اگر تمھیں غالب سے اس کا افسانۂ محبت سننا ہے تو اٹھو گذری ہوئی رات کا دلکش افسانہ سنو ۔

دیکھیے اس غزل میں ، اس جکوری میں ، کتنی تازگی ہے ، کتنی آسودگی ہے اور کتنی کیف انگریزی ! شاید ایسی ہی کسی صبح کی کیفیت اپنی اردو غزل کے اس شعر میں بھی بیان کی ہے ۔ کہتے ہیں :

گل کھلے ، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

اور اب غالب کی زندگی میں وہ دور آ گیا جب وہ مغنئی آتش نفس ، وہ مطربہ رہزن تمکین و ہوش ، وہ بت غالیہ مو اور وہ بانوے مغاں شیوہ خود غالب سے والہانہ اور مجنونانہ محبت کرنے لگی اور بقول غالب انھیں اپنی بے کسی کی داد مل گئی :

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

لیکن یہ والہانہ شیفتگی دیکھ کر خود غالب حیران ہیں اور جب اس کی طرف

سے بے تابانہ اظہار عشق ہونے لگا تو خود ہی سوال کرتے ہیں :

ظالم ! تو و شکایت عشق ؟ این چہ ماجراست !
بارے بمن بگو ، کہ دلت داد خواہ کیست ؟

نیرنگ عشق ، شوکت رعنائی تو برد
در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست ؟

با این ہمہ شکست درستی اداے اوست
رنگ رخت ، نمونۂ طرف کلاہ کیست ؟

با تو ، بہ پند ، حرف بہ تلخی گناہ من
با من بعشق غلبہ دعوی گناہ کیست ؟

غالب کنون کہ قبلۂ او کوے دلبر است
کے می رسد بدین کہ دلش سجدہ گاہ کیست ؟

الھیں حیرت ہے کہ جس محبوبہ ، جس ظالم کے فراق میں راتیں تڑپ تڑپ کر گزارتے تھے اب وہی ان کے لیے بے چین ہے ۔ جس سے اظہار محبت کرتے تھے اب اسی کی طرف سے اظہار محبت ہو رہا ہے ۔ وہ تجاہل سے کام لیتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ آخر وہ کون ظالم ہے جس سے تجھے عشق ہوگیا ہے اور وہ کون خوش نصیب ہستی ہے جس سے داد خواہی چاہی جا رہی ہے ؟ بھئی ! یہ عشق کا جادو بھی خوب ہے ، جو حسن سے اس کی ساری شان و شوکت چھین لے گیا اور اب اس کے پاس ناز کے بجاے صرف نیاز رہ گیا ہے ۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کس حسین کی چشم سیاہ ہے جس نے تجھے شکار کر لیا ہے ۔ میں نے نصیحت کی اس قدر بے تابی کا اظہار نہ کرو سب کے سامنے اظہار محبت نہ کرو ہماری محبت کا راز غیروں پر کھل جائے گا ، ہنگامے برپا ہوں گے ۔ میں نے مانا میری باتوں میں تلخی تھی ، مانا کہ اس میں میرا قصور تھا لیکن یہ بھی تو کہو میرے ساتھ اس قدر شدت سے محبت کرنے میں کس کا قصور ہے میرا یا تمہارا ؟ لیکن اس پروانہ وار محبت کرنے والی محبوبہ کے پاس ، جواب میں ”یک نگہ ، یک خندۂ دزدیدہ یک تابندہ اشک“ کے سوا کچھ نہ تھا ۔ وہ دیوانہ وار آتی ، پروانہ وار اپنی شمع کے گرد گھومتی ہے اور آخرکار اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔

ایک بڑی حسین غزل میں غالب نے اپنی اور اس کی حالت کو بڑے کیف انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے جس کا لفظ لفظ محبت اور مسرت کی غمازی کرتا ہے :

گفتم ، ز شادی نبودم گنجیدن آسان در بغل
تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل

نازم خطر ورزیدنش وان ہرزہ دل لرزیدنش
چینے ببازی بر جبین دستی بدستان در بغل

آہ از تنک پیراہنی کافزون شدش تر دامنی
تاخوی برون داد از حیا گردید عریان در بغل

دانش ہمے در باختہ ، خود را ز من نشناختہ
رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل

تا پاس دارد خویش را مے در گریبان ریختی
خستی چو رفتی زان میش گل از گریبان در بغل

گاہم بہ پہلو خفتہ خوش ، بستی لب از حرف و سخن
گاہم ببازو ماندہ سر ، سودی زنخدان در بغل

تا خواندہ آمد صبح گہ بند قبایش بے گرہ
و اندر طلب منشور شہ نکشودہ عنوان در بغل

مے خوردہ در بستان سرا ، مستانہ گشتی سوبسو
خود سایہ' او را ازو صد باغ و بستان در بغل

چون غنچہ دیدی در چمن گفتی بہ گلبن کت زمن
چون رفتہ ناوک از جگر چون ماندہ پیکان در بغل

ہاں غالب خلوت نشین بیمے چنان عیشے چنین
جاسوس سلطان در کمین مطلوب سلطان در بغل

کہتے ہیں میں نے اپنی محبوبہ سے کہا کہ میں اس قدر خوش ہوں کہ مسرت کے باعث کسی کے پہلو میں نہیں سما سکتا ۔ یہ سن کر میری بھولی محبوبہ نے انتہائی بھولے پن سے مجھے خوب بھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا ۔ مجھے فخر ہے کہ وہ خطرات کی پروا نہیں کرتی اگرچہ اس کا دل لرزتا رہتا ہے ۔ وہ مجھے چھیڑنے کے لیے شرارت سے تیوریوں پر بل ڈالتی ہے اور حیلہ جوی سے بغلوں میں ہاتھ چھپا لیتی ہے ۔ آہ وہ اس کا نازک اور باریک لباس جس کے باعث تر دامنی میں اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ پہلو میں عریاں ہوتی تو شرم سے پسینہ میں شرابور ہو گئی ۔ میری محبوبہ جب میرے پاس آئی تو نشے میں چور تھی ، ہوش و حواس گم تھے ۔ اس وقت وہ مجھ میں اور اپنے آپ میں امتیاز نہ کر سکتی تھی ۔ اس نے اپنا چہرہ شرم سے میری آغوش میں چھپا لیا ۔ اس کی عجیب حالت تھی ۔ کبھی ہوشیار رہنے کے لیے گریبان میں شراب انڈیل لیتی اور کبھی نشے سے مدہوش ہو کر اس کی حالت ایسی ہو جاتی تھی جیسے مسلے جانے پر پھول کی حالت ہو جاتی ہے ۔

کبھی وہ انتہائی مستی اور سرور کے عالم میں مطمئن اور آسودہ ، میرے پہلو میں لپٹ جاتی اور زبان سے ایک حرف نہ نکالتی ، کبھی میرے بازو پر سر رکھتی اور کبھی اپنے زنخدان کو میری بغل میں ملتی تھی -

اور اب غالب ایک عجیب و غریب واقعہ کا انکشاف کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی محبوبہ ، ستم پیشہ ڈومنی ، بتِ مغاں شیوہ ، رہزن تمکین و ہوش مطربہ کی رسائی شاہی محفلوں تک تھی - کہتے ہیں کہ ایک روز صبح صبح میری محبوبہ میرے پاس آئی - اس کی قبا کے بند کھلے ہوئے تھے - بغل میں بادشاہ کی طرف سے طلبی نامہ تھا لیکن ان کھلا - غالب اسے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں ''جاسوس سلطان'' کا خیال آتا ہے ؛ بدنامی کا اندیشہ ہے ، بادشاہ کے عتاب کا خوف ہے ، مطلوب سلطان یعنی اپنی محبوبہ کا بھی خیال ہے - ''ہم چناں عیش چنیں'' سے دو متضاد کیفیات کا اظہار ہوتا ہے جس میں خوف کے ساتھ احساس فخر بھی ہے اور مسرت بھی کہ اس نے مجھے بادشاہ پر ترجیح دی ہے -

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کون تھا جس کی مطلوب یہ ستم پیشہ ڈومنی اور یہ مطربۂ دل نواز تھی جس کے لیے شاہی جاسوس لگے رہتے تھے ؟

دہلی کے تخت پر ۱۸۰۶/۱۲۲۱ سے ۱۸۳۷/۱۲۵۳ تک ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ (ثانی) متمکن رہے[۱۲]- غالب کی محبت اسی دور میں پروان چڑھی - بادشاہ کی عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب تھی - دربار پر ڈوم ڈھاری اور خواجہ سرا قابض ہو چکے تھے - شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب کا ہنگامہ برپا رہتا تھا جس میں غالباً اس نوجوان مطربۂ شیریں ادا کو بھی طلب کیا جاتا تھا -

بہرحال غالب کی زندگی کا یہ بہترین دور تھا جب اُن کی محبوبہ اُن کے ہمسائے میں رہتی تھی - جب اُن کی کامرانی اور شادمانی کا دور تھا اور جب اُنھیں بقول ان کے فکرِ دنیا میں سر نہیں کھپانا پڑتا تھا اور بقول ان کے یہ وہ زمانہ تھا جب :

اُدھر متھرا داس سے قرض لیا ، ادھر درباری مل کو جا مارا ، ادھر خوب چند نین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی - ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود ، شہد لگاؤ چاٹو ، نہ مول نہ سود - اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بھوپی کے سر - بایں‌ہمہ کبھی خان (احمد بخش) نے کچھ دے دیا ، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا ، کبھی ماں نے آگرے سے کچھ بھیج دیا[۱۳]-''

۱۲- اکبر شاہ ثانی : تاریخ پیدائش ۲ رمضان - ۱۷۵۱/۱۱۷۳ -

۱۳- خط بنام علائی ، مورخہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ - اُردوے معلی (۱۸۶۹) - ۴۴۳ -

دن عید اور رات شب برات تھی ، ایک والہانہ محبت اور مسرت کا دور۔ عیش بافراغت کے مزے تھے لیکن مسرت کی لافانی ساعتیں بھی غم جدائی اور الم فراق میں بدل جاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ مغنیٔ آتش نفس ، یہ عشق پیشہ محبوبہ ، اپنے محبوب (غالب) سے مل نہیں سکتی راستہ میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں ۔ غالب شادی شدہ ہیں ایک ''معزز'' گھرانے میں ان کی شادی ہوئی ہے ۔ (حالانکہ اس دور میں اس طبقہ کی ہوس کاریاں عام تھیں) ۔ محبوبہ ''مطلوب سلطان'' ہے ، کوتوال شہر کا بھی خوف ہے اور ''جاسوس سلطان'' کا بھی ۔ کھل کر ملاقات نہیں ہو سکتی ، چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی ہیں ۔ غالب اپنی محبوبہ کی اس قلبی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں :

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل
درد جدائی اسد اللہ خان نہ پوچھ

آپ فعل کی تذکیر کے بارے میں نہ سوچیے ۔ یہ تو غزل کی روایتی زبان ہے ، جس میں غالب ایک واقعہ بیان کر رہے ہیں جس سے ان کی محبوبہ کی دلی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ محبت کے دن اور محبت کی راتیں اس طرح مسرت اور الم کے درمیان گزر رہی تھیں ۔ اس محبت کے چرچے ہونے لگے تھے کہ ایک رات ، معلوم نہیں کیا واقعات پیش آئے ، کون سے انکشافات ہوئے ، کیسے ہنگامے برپا ہوئے ، کن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ، لوگوں نے کیا کہا اور کیا کیا کہ ''یہ مہتاب شب جمعہ ماہ رمضان'' یہ محبوبہ غالب نواز ، ''شرم رسوائی'' اور الفت کی پردہ داری کرنے کے لیے نقاب خاک میں جا کر چھپ گئی اور غالب کی نظر میں دنیا تاریک ہو گئی ، زندگی بے معنی ہو گئی ، آنکھوں سے جوے خون بہنے لگی جس میں قلم ڈبو کر غالب نے ایک مرثیہ لکھا ۔

آج غالب کی محبوبہ اور اس کے بعد وہ خود بھی دنیا سے رخصت ہو کر پیوند زمین ہو چکے ہیں لیکن یہ دردناک داستان محبت ابھی تک ان کی کلیات میں محفوظ ہے :

سر چشمۂ خون است ز دل تا بہ زبان ہاے
دارم سخنی با تو و گفتن نتوان ہاے

سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویان
نظارہ بود شبنم و دل ریگ روان ہاے

ذوقیست درین مویہ کہ بر نعش منتش
با دل شدۂ ہیچ مگوے ہمہ دان ہاے

در خلوت تابوت نرفتست ز یادم
بر تختہ در دوختہ چشم نگران ہاے

اے فتوی ناکامی مستان کہ تو باشی
مہتاب شب جمعۂ ماہ رمضان ہاے

باد آور ناگفتہ شنو رفت حوالت
دردے کہ بگفتن نہ پزیرفت گران ہاے

از جنت و از چشمۂ کوثر چہ کشاید
خون گشتہ دل و دیدۂ خوں نابہ فشان ہاے

در زمزمہ از پردۂ و ہنجار گزشتیم
رامشگریٔ شوق بہ آہنگ فغان ہاے

سیماب تنی کز رم برق ست نہادش
گردیدہ مرا مایۂ آرامش جان ہاے

غالب بدل آویز کہ در کارگہ شوق
نقشی ست درین پردہ بصد پردہ نہان ہاے

لیکن یہ داستان محبت ، محبوبہ کا یہ مرثیہ ، غالب نے فارسی ہی میں نہیں اردو میں بھی ہمارے لیے محفوظ کر دیا ہے ۔ چنانچہ اسے نسخہ فوجدار محمد خاں اور شیرانی سے نقل کیا جاتا ہے ۔ دیکھیے تو اس سے کیسے کیسے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس خفیہ محبت کا راز آشکارا ہو گیا تھا ۔ شاہی سزا کا خطرہ اس کے لیے بھی تھا اور اس کے محبوب غالب کے لیے بھی ۔ اس لیے عشق نے حسن کے لیے قربانی دی اور غالب کی محبوبہ نقاب خاک میں پناہ لے کر اپنی محبت کے انمٹ نشان چھوڑ گئی ۔ ملاحظہ ہو غالب نے اس کی وفات پر اپنے احساسات کس طرح پیش کیے ہیں :

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے !
کیا ہوی ظالم ! تری غفلت شعاری ہائے ہائے !

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہاے ہاے !

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی ، میری دوستداری ہاے ہاے !

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہاے ہاے !

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!

گلفشانیہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تری لالہ کاری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے!

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے!

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تار برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تسپر یہ نا اُمید واری ہائے ہائے!

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے **اسد**
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے!

حاتم علی مہر کو اسی محبوبہ عشق پرور کے بارے میں ''چنا جان نہ سہی منا جان سہی''[۱۴] لکھ کر تفریحی پیرائے میں مہر کا غم غلط کرنا اور غم دوست کو فراموش کرانا مقصود تھا ۔ ورنہ اس نظم کا ایک ایک لفظ اس درد کی ترجمانی کر رہا ہے جو غالب کے دل کو تڑپا رہا تھا اور جس کے باعث ان کا جی اس زمانے میں زندگی سے بھی بیزار ہو گیا تھا ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

مجھ سے مت کہہ ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا!
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے نا چار ہے

غالب کی داستان محبت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے اپنی غزلوں میں کہیں تو اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور کہیں اپنی محبوبہ کے جذبات کی ، اسی قسم کی ایک غزل میں محبوبہ سے اس کی درد بھری داستان سنیے ۔

بیا و جوش تمنائے دیدنم ، بنگر چو اشک ، از سر مژگان چکیدنم بنگر

۱۴- اُردوے معلیٰ : بنام حاتم علی مہر ۔

ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی | بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر
گزشتہ کار من از رشک غیرشرمت باد | بہ بزم امن تو خود را ندیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیان گہ شد | در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
نیازمندیٔ حسرت کشان نمی دانی | نگاہ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
اگر ہوائے تماشائے گلستان داری | بیا و عالم در خون تپیدن بنگر
بداد من نہ رسیدی ز درد جان دادم | بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر

اے میرے محبوب ! آ اور دیکھ کہ تجھے دیکھنے کی مجھے کس قدر تمنا ہے اور میں تیرے فراق میں کس طرح آنسو بہا رہی ہوں ۔

ہاں میں تیرے فراق میں تڑپتی تھی ۔ یہی میرا جرم تھا جس کے باعث تو نے علیحدگی اختیار کر لی تھی ۔ آ میری قبر پر آ اور دیکھ کہ میں کس طرح آرام کر رہی ہوں ۔

اب میرے دل میں تیرے لیے کسی سے رشک کی گنجائش نہیں رہی ۔ میں تیری بزم عیش سے کنارہ کش ہو چکی ہوں ، اب کوئی ہنگامہ نہیں ۔ امن ہی امن ہے تجھے شرم آنی چاہیے ۔

ذرا ایک نظر ادھر بھی تو دیکھ ۔ دانا اُگا ، بڑھا اور آشیانہ بھی تیار ہو گیا ۔ دیکھ میں نے ہما کے انتظار میں کس طرح جال بچھا رکھا ہے ۔

غالباً تو حسرت کشوں کی نیازمندی سے واقف نہیں ۔ ذرا میری نگاہ بن کر چور نظروں سے دیکھنا سیکھ اور یہ معلوم کر کہ میں تیری طرف کس طرح دیکھتی رہتی ہوں ۔ اگر تجھے تماشائے گلستان دیکھنے کی ہوس ہے تو آ اور میرے خون میں تڑپنے کا نظارہ کر ۔

میں نے تیری محبت کے درد سے جان دے دی اور تو میری فریاد کو نہ پہنچا ۔ آ اور ذرا اسے بھی دیکھ لے کہ میں نے تیرے طرز تغافل کی داد کس طرح دی ہے ۔

اپنی یہ کیفیت اپنے محبوب غالب کو دکھانے کے بعد ایک بار اپنے محبوب کو '' بیتے ہوئے دن عیش کے '' یاد دلاتی ہے ۔ ابتدائے عشق کا وہ زمانہ جب وہ غالب سے دیوانہ وار محبت کرنے لگی تھی ، جب غالب کو زبان خلق کا خوف تھا اور اُسے پروائے ننگ و نام نہ رہی تھی ۔

اس کی موت پر شہر میں اور شہر کے لوگوں پر کیا گزری ۔ اسی کی زبان سے سنیے ۔

بمرگ من کہ پس از من ز مرگ من یاد آر
بکوے خویشتن آن نعش بے کفن یاد آر

من آن نیم کہ ز مرگم جہان ہمہ نہ خورد
فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر

ببام و در ز ہجوم جوان و پیر بگوی
بکوی و برزن اندوہ مرد و زن یاد آر

بہ ساز نالہ گروہی ز اہل دل دریاب
بہ بند مرثیہ جمعی ز اہل فن یاد آر

ملال خلق و نشاط رقیب در ہمہ حال
غریو خویش بہ تحسین تیغ زن یاد آر

بخود شمار وفا ہاے من ، ز مردم پرس
بمن حساب جفا ہاے خویشتن یاد آر

چو دید جان من از چشم پر خمار بگوی
چہ رفت بر سرم از زلف پرشکن یاد آر

خروش و زاریٔ من در سیاہی شب زلف
دم فتادن دل در چہ ذقن یاد آر

بسنج تا ز تو برمن دران محل چہ گزشت
نخواندہ آمدن من در انجمن یاد آر

ز من پس از دو سہ تسلیم یک نگہ وانگہ
ز خود پس از دو سہ دشنام یک سخن یاد آر

اے میرے محبوب ! میری جان کی قسم ! اگر میرے مرنے کے بعد تو مجھے یاد کرے تو اپنی گلی میں میری نعش بے کفن کا خیال کر !

میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی موت پر دنیا میں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو ۔ اس لیے یاد کر کہ میرے مرنے پر شیخ و برہمن نے کس طرح آہ و زاری کی تھی ۔

بام و در پر نوجوانوں اور بوڑھوں کے ہجوم کا تصور کر اور گلی کوچوں میں عورتوں اور مردوں کا اندوہ یاد کر ، جو میری موت کی خبر سن کر نکل آئے تھے ۔

پھر اس منظر کو بھی یاد کر جب اہل دل آہ و زاری کر رہے تھے اور اہل فن مرثیے سنا رہے تھے ۔

خلق غمگین تھی ، دشمن خوش تھے اور ہاں تیغ زن کی شمشیر زنی پر اپنا نعرۂ تحسین بلند کرنا بھی یاد کر ۔

اپنے ساتھ میری وفاؤں کا شمار کر ، اس کے بعد لوگوں سے پوچھ اور اس

کے ساتھ ہی ذرا اپنی جفاؤں کا بھی تو شمار کر لے ۔

میری روح نے تیری مخمور آنکھوں میں کیا دیکھا اور مجھ پر تیری زلف پر شکن نے کیا قیامت ڈھائی ؟ ذرا اسے بھی تو یاد کر لے ، جب میرا دل تیری محبت میں گرفتار ہوا تھا ۔

اور ہاں ! راتوں میں ذرا میری آہ و زاری بھی تو یاد کر اور یہ بھی یاد کر کہ تیرے فراق میں مجھ پر کیا گزرتی تھی ۔

اور یہ بھی تو یاد کر کہ ایک مرتبہ میں تیری محفل میں بے بلائے آ گئی تھی تو 'تو نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا ، تو نے میرے دو تین بار سلام کرنے پر ایک مرتبہ اچٹتی نگاہ سے دیکھا تھا اور دو تین بار برا بھلا کہنے کے بعد ایک بات کی تھی ۔

اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حسینہ کی موت معمولی لوگوں کی سی موت نہ تھی ، شہر میں اس کی موت سے ہنگامہ برپا ہو گیا تھا ، شیخ و برہمن سب ہی کو صدمہ پہنچا تھا کیونکہ یہ ایسی حسینہ کی موت تھی جو خود حسن پرست تھی ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جنازہ غالب کی گلی سے گزرا تھا جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مکان غالب کی قیام گاہ سے بہت زیادہ دور نہ تھا[۱۵] ۔

اس شکایت نامے کے بعد غالب کی وہ غزل بھی ملاحظہ ہو جو محبوبہ کی زبان سے اس کی وفات کے بعد کہلوائی گئی ہے اور جس میں محبوبہ کہتی ہے کہ اب میرے بعد حسن کا کوئی قدردان نہ رہا ۔ ساقی بار بار ''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق'' کی صدائیں مختلف لہجوں میں دیتا ہے لیکن ہاں کہنے اور میری طرح عشق کا ساغر کش بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ۔ غزل میں روایتی انداز ہونے کے باوجود ذرا اس کا لہجہ اور اس کی روح ملاحظہ ہوں :

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولئی انداز و ادا میرے بعد

۱۵۔ نسخۂ فوجدار کا یہ شعر لائق توجہ ہے :

طلسم مستی دل آنسوے ہجوم سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

در خور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیاہ[۱۶]
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد[۱۷]

شاید حسب ذیل شعر بھی اسی حادثے کی ترجمانی کرتا ہے:

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہوگئے

قیاس کہتا ہے کہ شعر میں محبوبہ کے نام کے بجائے اسد تخلص داخل کر دیا گیا ہے اور یوں بھی عشق کی موت میں حسن کی موت بھی تو پنہاں ہوتی ہے۔ اس

۱۶- اس سلسلے میں ” ناخواندہ آمدن من در انجمن یار آر “ والی غزل ملحوظ رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حسینہ شمع محفل احباب بھی ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح دیکھیے ” خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود“ والی غزل بھی۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گلدستۂ احباب کا ایک پھول مومن خاں بھی تھے۔

۱۷- غزل کی یہ شکل نسخۂ شیرانی سے لی گئی ہے۔

کی موت کے بعد یوں بھی اب خود ہی محبوبہ کی طرف سے شکایت کرتا اور خود ہی جواب دیتا تھا ، افسوس کرتا تھا ، شرمندہ ہوتا اور یاد کرتا تھا ۔ چنانچہ کئی سال بعد کلکتہ جاتے ہوئے ایک غزل میں جو باندے سے دہلی بھیجی گئی تھی کبھی کہتے ہیں کہ ''رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے'' اور کبھی ''انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں'' کا نعرہ لگاتے ہیں :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارےہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

اور کبھی اپنی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں :

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ڈھونڈے ہے اس ''مغنئ آتش نفس'' کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

بیادِ گرمئ صحبت برنگ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

یا پھر پکار اُٹھتے ہیں :

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ! وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں !
تھی وہ''اک شخص'' کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں !

کبھی آسمان کی طرف نظر اُٹھتی ہے تو وہی مطربۂ شیریں ادا ، وہی مغنی آتش نفس اور وہی رہزن تمکین و ہوش اور اس کا دیکھتے دیکھتے نظروں سے چھپ جانا یاد آتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اور کبھی عالم خیال میں اسے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں :

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ذہن پر گزرے ہوئے مسرت انگیز لمحوں کی تصویریں اُبھر آتی ہیں ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی ہے کبھی انتظار کی بے تاب گھڑیاں یاد آتی ہیں اور

کبھی محبوبہ کی عشوہ طرازیاں ، کبھی آنے کی خبر پا کر مسرت سے پھول کی طرح کھل جانا یاد آتا ہے اور کبھی خود اپنی طرف سے شرارتیں اور جھگڑے یاد آتے ہیں ۔ ان دلکش ، طرب انگیز اور الم خیز لمحوں کو یاد کرکے شاعر بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے :

رفت آنکہ کسب بوے تو از باد کرد می
گل دید می و روئے ترا یاد کرد می

رفت آنکہ گر براہ تو جاں داد می ز ذوق
از موج گرد رہ نفس ایجاد کردمی

رفت آنکہ گرلبت نہ بہ نفریں نواختی
رنجیدمی و عربدہ آغاز کردمی

رفت آنکہ قیس را بسترگی ستودمی
در چابکی ستایش فرہاد کردمی

رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمی
در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمی

رفت آنکہ در ادائے سپاس پیام تو
ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمی

اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمی

بندم منہ ز طرہ کہ تابم نماندہ است
رفت آنکہ خویش را بہ بلا شاد کردمی

آخر بداد گاہ دگر اوفتاد کار
رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کرد می

غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کرد می[۱۸]

ہائے وہ زمانہ جب ہواؤں میں تیری خوشبو سونگھتا اور پھولوں کو دیکھ کر تیری صورت یاد کرتا تھا ۔

۱۸- خلخ : دریائے سیحوں کے پار ترکوں کا ایک قبیلہ ۔ پرانے شعرا اس کے حسن و جمال کے معترف تھے ، یہ لوگ خرلخ اور قرلق بھی کہلاتے تھے ۔
نوشاد : ایک شہر یا بتکدہ ، فرہنگ عمید ، تہران ۔

ہائے وہ زمانہ جب ذوق و شوق کے عالم میں اگر تیری راہ میں جان دیتا تو گرد راہ کی موجیں نئی زندگی بخشتی تھیں !

ہائے وہ زمانہ جب تو مجھے برا بھلا نہ کہتی تو تجھ پر ناراض ہوتا اور جھگڑتا تھا کہ آج تو خاموش کیوں ہے ، آج مجھ پر خفگی کیوں نہیں ؟

ہائے وہ زمانہ جب میں اپنے مقابلے میں قیس کی تنومندی کی تعریف اور فرہاد کی چابک دستی پر اس کی ستایش کرتا تھا ۔

ہائے وہ زمانہ جب تیرا روے زیبا اور قد و قامت دیکھ کر گل و شمشاد کے بارے میں بحثیں کرتا اور انھیں بے حقیقت قرار دیتا ۔

ہائے وہ زمانہ کہ تیرا پیغام آتا تو اس خوشی میں پنجروں میں بند سینکڑوں پرندوں کو رہا کر دیتا تھا ۔

لیکن آہ آج زمانہ بدلا ہوا ہے ، آج تو تیری وفائیں یاد کرکے دکھ ہوتا ہے ۔ ہائے وہ زمانہ ! جب میں تیری جفاؤں پر فریاد کرتا تھا ۔

مجھے اب اپنے طرہ کی ڈوریوں سے نہ باندھ کہ اب مجھ میں تاب و تواں باقی نہیں رہی ۔ ہائے اب وہ زمانہ نہیں جب مجھے تکلیفیں اٹھانے میں بھی لطف آتا تھا ۔

ہائے وہ زمانہ جب میں تیرے ظلم و ستم کے شکوے کرتا تھا ، اب تو میرا معاملہ دوسرے ہی داد گر (خدا) سے ہے جس سے تیری جدائی کی شکایت کرتا اور اُسی سے انصاف طلب کرتا ہوں ۔

آخر میں کہتے ہیں اے غالب ! اب میرا جی اس دنیا ہی سے بیزار ہو گیا ہے ۔ بے عشق زندگی بیکار ہے ۔ دل چاہتا ہے کعبے کو چلا جاؤں اور وہاں خدا کے گھر میں خدا سے فریاد کروں ۔ ہاے وہ زمانہ جب میرا جی چاہتا تھا کہ خلخ اور نوشاد کے حسینوں سے تیرے حسن کا مقابلہ کروں ۔

غالب کی یہ دلکش ، حسین اور غم انگیز یادیں اسے ہمیشہ تڑپاتی رہیں ۔ اپنی محبوبہ کی وفائیں اور والہانہ محبت کی یاد اسے ہمیشہ ستاتی رہی اور وہ زندگی بھر اپنی قلبی کیفیتوں کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا رہا :

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا	دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز	پھر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا ، یعنی	پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال	دل گم گشتہ مگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی	کیوں تیرا رہگزر یاد آیا

کبھی عرض نیاز عشق کے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنی محبوبہ کی کمی محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب میرے پاس وہ دل ہی نہیں جس پر مجھے ناز تھا اور جس کے باعث میں اپنی محبوبہ کی خدمت میں عرض نیاز عشق کر سکتا تھا :

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ہر چند ہوں میں طوطیٔ شیریں سخن و لے
آئینہ آہ میرے مقابل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ ، در خور محفل نہیں رہا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہوں قطرہ زن بوادی وحشت شبانہ روز
جز تار اشک جادۂ منزل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

محبوبہ کی زندگی میں انتظار کی راتیں تھیں ، وصل کی راتیں تھیں ، اضطراب کی راتیں تھیں ، مسرت کی راتیں تھیں ، لیکن اب صرف یادوں کی راتیں رہ گئی تھیں جن میں ہجر کا سا اضطراب تھا ، لیکن وصل کی امید باقی نہ رہی تھی ۔ ایسی ہی ایک رات کی کیفیت غالب نے دو غزلوں میں بیان کی ہے :

(۱)

رات ، دل ، گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
رنگ روئے شمع ، برقِ خرمنِ پروانہ تھا

شب کہ تھی کیفیت محفل بیاد روئے یار
ہر نظر ، داغِ مے خالِ لبِ پیمانہ تھا

درد کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا
دیکھ اس کے ساعد سیمین و روئے پر نگار
شاخ گل جلتی تھی ، مثل شمع گل پروانہ تھا
اے اسد رویا جو دشت غم میں میں حیرت زدہ
آئینہ خانہ ہجوم اشک سے پروانہ تھا

(۲)

بسکہ جوش گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاک موج سیل تا پیراہن دیوانہ تھا
شب تری تاثیر سحر شعلۂ آواز سے
تار شمع آہنگ مضراب پر پروانہ تھا
انتظار جلوۂ کا کل میں ، ہر شمشاد باغ
صورت مژگان عاشق ، صرف عرض شانہ تھا
جوش بے کیفیتی ہے اضطراب آرا اسد
ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا

ایسی ہی ایک رات کی داستان ایک اور غزل میں ملاحظہ ہو جس سے محبوبہ کی وفات کے بعد غالب کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جس سے وہ اس وقت گزر رہے تھے :

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا
حاصل اُلفت نہ دیکھا جز شکست آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک لب افسوس تھا
پوچھ مت بیماریٔ غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا
مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا
کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں
دست برسر ، سر بزانوے دل مایوس تھا

زمانہ ایک مسکن مرہم ہے ، وقت گزرنے کے ساتھ زخم مندمل ہونے لگتے ہیں - سوزش میں شدت نہیں رہتی لیکن ”احباب چارہ سازی وحشت“ نہیں

کر سکتے ۔ دل کا درد نہیں جاتا ۔ کبھی نہ کبھی ٹیسیں اٹھتی ہی رہتی ہیں ۔ بھلانے کی کوشش کرنے پر بھی بعض صورتیں بھلائی نہیں جا سکتیں ۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا ، سنتا بولنا اور نہ جانے کیا کچھ یاد آتا رہتا ہے ۔ چنانچہ مدتوں بعد ۱۸۵۲ء میں پچپن سال کی عمر میں ، غالب نے ایک غزل لکھی ۔ اس میں بھی اسی محبوبہ اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دن ، درباری شاعری اور روایتی پردوں کے باوجود ، نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ جب غالب ایک مسرت انگیز دور سے گزر رہے تھے ۔ ملاحظہ ہو :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہ چاکِ گریباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل لکھتے وقت غالب کے ذہن میں اپنی معاشی اور سماجی پریشانیوں کے باوجود اپنی بت مغاں شیوہ ، اپنی مطربہ شیریں ادا ، رہزن تمکین و ہوش اور ستم پیشہ محبوبہ نہ تھی ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں ، جو اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی تھیں ، وہی بزم آرائیاں نہ تھیں جو اپنی محبوبہ کے ساتھ گزری تھیں ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ شام فراق میں اس کی آنکھوں سے جوئے خون نہ بہی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی محبوبہ کی سیاہ زلفیں نہ تھیں جو غالب کے شانوں پر پریشان ہو کر غالب کے مشام جاں کو معطر کرکے ایسے سکون بخش نیند عطا کرتی تھیں اور اندھیری راتوں کو حسین ، دلکش اور مسرت انگیز راتوں میں تبدیل کر دیتی تھیں ؟

لیکن انسان زندگی بھر آنسو نہیں بہا سکتا ، عشق فعل دماغ ہی سہی لیکن

زندگی بھر آنسو بہانا ایک جسمانی بیماری ہے۔ زندگی کے ہمہمے بڑے سے بڑے غموں پر بھی بھول کے دبیز پردے ڈال دیتے ہیں۔ دوست، ہمدرد اور عزیز نصیحتیں کرتے ہیں اور صحت مند انسان اگرچہ بیتے ہوئے دنوں کی حسین یادوں کو فراموش نہیں کرتا لیکن آنسو بہنا بند ہو جاتے ہیں، سرد آہیں عام بات چیت میں بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

ایک مرشد کامل نے ہم کو نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔۔۔۔‘‘

غالباً اس مرشد کامل ہی کی نصیحت سے متاثر ہو کر غالب نے یہ شعر کہا تھا:

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

نسخہ فوجدار محمد خاں کی ایک غزل کے حسب ذیل شعر شاعر کی اس ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں جو ''مرشد کامل'' کی نصیحت کے بعد ہوئی۔ اس غزل کے اشعار خود محبوبہ کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں:

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

مے پرستاں خم مے منہ سے لگا لو یعنی
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب نے خم مے منہ سے لگایا، غم کو غلط کیا، اک گونہ بے خودی چاہی۔ نہ صرف اپنے غم کو غلط کیا بلکہ مظفر حسین خاں وغیرہ کے غموں کو

بھی اور ''چنا جان نہ سہی منا جان سہی'' کہہ کر حاتم علی مہر کے غم کو بھی غلط کرنے کی کوشش کی ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کے دل میں محبت کی کسک باقی تھی اور ان کی محبت ہنگامی نہ تھی۔ لیکن یہ مرشد کامل کون تھے ؟ میاں کالے ؟ حسام‌الدین حیدر خاں نامی[۱۹] اور خود غالب کی صحت مند فکر ؟ اس محبوبہ کا نام کیا تھا ؟ اختر ؟ ناہید ؟ یا کوئی اور ؟

غالب کی داستان حیات اور اس کی پروانہ وار محبت کرنے والی محبوبہ کے بارے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن ٹھوس دلائل فراہم ہونے تک ''مرشد کامل'' اور محبوبہ کے نام سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا[۲۰]۔ قیاس کے گھوڑے اگرچہ بعض شواہد کی بناء پر ضرور دوڑائے جا سکتے ہیں لیکن قیاس کے گھوڑے ہمیشہ منزل تک نہیں پہنچاتے :

کچھ اور چاہیے اثبات ادعا کے لیے

۱۹- چو حرز بازوے ایمان نویسم حسام الدین حیدر خاں نویسم

۲۰- مجھے یقین ہے کہ غالب کو طرز بیدل سے ہٹانے میں نہ '' سخنوران جاہل'' کا اتنا حصہ تھا اور نہ ''سخنوران کامل'' کا بلکہ یہ غالب کا عشق تھا اور اس کی محبوبہ جس نے آسان گوئی کی طرف غالب کی رہنمائی کی اور اسداللہ خاں کو غالب نام آور بنا دیا۔